⊙ سدرہ عارف

ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، جی سی ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ

⊙⊙ ڈاکٹر محمد افضال بٹ

صدر شعبہ اُردو، جی سی ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ

⊙⊙⊙ ڈاکٹر طاہر عباس طیب

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، جی سی ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ

علی عباس جلال پوری کی نثری تخلیقات (افسانہ، ناول، ڈراما، مکاتیب): ایک جائزہ

Abstract:

Literature has evolved from classic era to present times. Every era's writers, poets, critics and philosophers have added to this treasure. Literature takes its topics from life in general and society in particular. We find a lot of literature that proved their mettles in their particular genres; however, there are a few who have excelled in several genres at the same time. In Urdu literature, one such personality is Ali Abbas Jalal Puri who is a famous philosopher, fiction writer and critic. He started his literary journey by writing short stories. Later, he also wrote novels. In addition, his letters also add great richness to Urdu literature. His literary services are wonderful reflection not only of his experiences but also of his thought and philosophy. This article seeks to review literary services of Ali Abbas Jalalpuri's fiction.

Keywords:

Versatile Literature Fiction Literary Letters Novel Shortstory Jalalpuri Ali Abbas

ادب (Literature) اردو میں مستعمل اصطلاح عربی زبان کا لفظ، اپنے مختلف معنی ومفہوم کا حامل ہے۔ عربی میں اسے ضیافت اور مہمان نوازی کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ عربوں کے نزدیک چونکہ مہمان نوازی

شرافت سمجھی جاتی تھی اس لیے شائستگی، سلیقہ، خوش بیانی، چاشنی اور حسن ادب کے معنوں میں شامل ہوا۔ فرہنگ تلفظ میں شان الحق حقی نے ادب کے معنی یوں بیان کیے:

''اَدَب۔ تعظیم، تکریم، لحاظ، خوش اسلوبی، شائستگی؛ کسی زبان کی یا کسی موضوع پر دقیع، عمدہ، دل پسند تحریریں، نظم ونثر کی تخلیقات اور ان سے تعلق رکھنے والی تنقیدی یا تحقیقی انشائیں۔''(۱)

انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کے مطابق:

ترجمہ (مقالہ نگار): ''فنی طور پر ادب، الفاظ کی ایسی تنظیم ہے جو مسرت بخش ہے اور ان (الفاظ) کی مدد سے یہ ادب تجربے کی ترسیل اور ارتقاع کرتا ہے۔''(۲)

ادب نظریات اور انسانی خواہش کے وجود سے جنم لیتا ہے۔ انسانی زندگی کے افکار وخیالات، احساسات کا اظہار و بیان، زبان اور الفاظ کے ذریعے جب دوسروں تک پہنچے تو ادب کہلاتا ہے۔ ایسا تمام سرمایہ جو جذبات اور فکر وتخیل سے تحریر میں لایا جائے جس کو پڑھ کر انسان خوشی اور مسرت حاصل کرے ادب ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''ایسی تحریر کو ادب کہا جا سکتا ہے۔ جس میں الفاظ اس ترتیب و تنظیم سے استعمال کیے گئے ہوں کہ پڑھنے والا اس تحریر سے لطف اندوز ہو اس کے معنی سے مسرت حاصل کرے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب لفظ و معنی اس طور پر گھل مل جائیں کہ ان میں 'رس' پیدا ہو گیا ہو۔ یہی 'رس' کسی تحریر کو ادب بناتا ہے۔''(۳)

ایسی تحریر جس کا اثر وقتی نہیں ہوتا جو زمان ومکاں سے آزاد ہو کر آفاقیت کی حامل ہو وہی ابدیت کا درجہ رکھتی ہے۔ ادب میں انسان کے تخیل اور تجربے کو ابھارنے کی ایسی قوت ہوتی ہے کہ پڑھنے والا اس کا ادراک کر لیتا ہے۔ ادب کے بنیادی ستون خیال کی پرواز، رنگینی خیال، نزاکت، لطافت، قدرت، انسانی مشاہدات اور فکر کی گہرائی ہے۔ ادب کسی بھی معاشرے یا سماج کا وہ کلیدی عنصر ہے جو تہذیب کو ترقی کی راہ پر چلاتا ہے۔ جو قوموں کو تنزلی سے ترقی کی طرف لے جاتا ہے۔ انہیں عزت وعظمت عطا کرتا ہے۔ کسی بھی ملک وقوم یا معاشرے کے افراد اپنی عظمت، علم وذہانت، عمیق مشاہدے کو یا تو مذہب پر صرف کرتے ہیں یا پھر ادب کے ذریعے قوموں کے شعور کو بیدار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر خالد اقبال یاسر رقم طراز ہیں:

''ادیب جس خطہ ارضی کا باشندہ ہوتا ہے اس کا ماحول، توہمات، عقائد، روایات، رسوم، دینی تہوار، ملبوسات، فن تعمیر اور مظاہر فطرت اپنی تمام مرئی وغیر مرئی جزئیات کے ساتھ اس کے وجدان کا حصہ بن جاتے ہیں اور وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر مختلف زاویوں سے انہی مظاہر کے نقش اپنے فن میں ابھارتا چلا جاتا ہے۔''(۴)

ادیب عمل ادراک کی غیر معمولی قوت کے ذریعے شعور کی سطح کو بیدار کرتا ہے۔ جس سے جذبات، میلانات، تجربات ہمارے شعور کا حصہ بن جاتے ہیں اور ہم زندگی کے نئے معنی تلاش کر لیتے ہیں۔ ادیب زندگی کے مسائل کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ بہت سے لوگوں کا نقطہ نظر واضح ہو جائے۔ محمد خاور نوازش کے نزدیک:

''ادب کو زندگی کا ایسا اظہار کہا جا سکتا ہے جو کسی زبان کے وسیع ذخیرہ الفاظ میں سے چند اکائیوں

کی تنظیم سے وجود پاتا ہے۔ یہ اکائیاں وہ الفاظ ہوں گے جو زندگی کے مختلف احساسات، جذبات، خیالات اور فکر کو لطیف انداز میں پیش کرسکیں۔ گویا ادب کو جو چیز ادب کے درجے پر فائز کرتی ہے وہ زندگی ہے اور اس کا اظہار ہے۔"(۵)

لفظوں کے خوبصورت پیرائے میں ڈھال کر بیان کرنے کا ہنر صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز کو خوب صورت اور منفرد انداز میں جب کوئی ادیب بیان کرتا ہے تو اس معاشرے کی تصویریں جا بجا اُجاگر ہونے لگتی ہیں۔ ہر معاشرے کو فہم وفراست، حکمت و دانش، جذبات و احساسات اور سماجی شعور رکھنے والے افراد کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ یہی وہ طبقہ ہے جن کے ذریعے معاشرے کی حقیقی تصویریں منظر عام پر آتی ہیں اور یہی ذی شعور لوگ معاشرے میں بیداری پیدا کر کے اس کی نئی تشریح کرتے ہیں اور اپنی حکمت و دانش، فہم وفراست سے زندگی کے اُلجھے مسائل کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اردو ادب کی ایسی ہی ایک ہمہ جہت شخصیت علی عباس جلالپوری ہیں۔ وہ فلسفی اور مفکر ہونے کے ساتھ ساتھ بنیادی طور نثری ادب پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ سے کیا۔ دسویں جماعت میں ان کا پہلا افسانہ ہمایوں میں چھپا۔ جس کے بعد انکے متعدد افسانے فنون، نیرنگ خیال، ہمایوں، ادبی دنیا اور مخزن میں شائع ہوتے رہے۔ فکری وتنقیدی تصانیف کی وجہ سے علی عباس جلال پوری کا فکشن کا پہلو کہیں چھپ گیا۔ ان کے ذہنی اور فکری نظریات کی تفہیم وتشریح کو سمجھنے کے لیے ان افسانوں کا مطالعہ ضروری ہے۔ وہ اپنے افسانوں کے متعلق مقالات جلالپوری میں لکھتے ہیں:

"(۳۵۔۱۹۳۴ء) مختصر افسانے لکھنے کا شوق عام تھا۔ چنانچہ میں نے بھی کچھ مختصر افسانے لکھے، جو 'ہمایوں' میں شائع ہوئے۔"(۶)

لیکن بعد میں وہ علمی اور فلسفیانہ تحریروں کی طرف مائل ہوگئے۔ فکشن سے علمی وفلسفیانہ تحریروں تک کے سفر کے قصے کو اُن کے بیٹے حامد رضا جلالپوری بیان کرتے ہیں:

"۱۹۳۵ء میں مجھے دنیا کی بہترین کتابوں کی فہرست مل گئی۔ جس میں شاعری، تمثیل، ناول وغیرہ کے علاوہ فلسفہ، نفسیات، تقابلی مذہب، علم الانسان اور عالمی تہذیب کی کتابیں بھی شامل تھیں۔ ان کتابوں کے حصول اور ان علوم کی غواصی میں کئی سال بیت گئے۔ اس مطالعہ کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ میں افسانہ نویسی سے دست کش ہوگیا اور اپنے لیے عملی تحقیق کا میدان منتخب کرلیا۔"(۷)

علی عباس جلالپوری شاعر بھی تھے لیکن ان کا کلام منظر عام پر نہ آسکا۔ امجد علی شاکر کے مطابق:

"سید صاحب نے شاعری بھی کی تھی (میرے سوال پر بتایا) کہ ان کی شاعری شریف کنجاہی کے حافظے میں محفوظ ہے۔ میں نے شریف کنجاہی سے پوچھا تو کہنے لگے؟ کچھ یاد ہے، کچھ بھول گئی ہے میں نے کہا: جو یاد ہے، اسے لکھ دیجئے۔ انہوں نے وعدہ تو کیا، مگر وہ چل بسے۔ یوں ان کے ساتھ جلالپوری کی شاعری بھی رخصت ہوگئی۔"(۸)

اسی زمانے میں ترقی پسند تحریک کی بنیاد رکھی گئی تو علی عباس جلالپوری نے اجلاس میں شرکت کی لیکن بعد میں تحریک سے الگ ہو گئے۔ ان کی پوری زندگی مطالعہ، درس و تدریس اور تحقیق و تصنیف میں گزری۔ وہ حقیقت اور سچ کے متلاشی رہے۔ ان کی زندگی کا مقصد معاشرے کو مہذب بنانا، علم کی روشنی بانٹنا، جہالت کے اندھیروں کو دور کرنا، سوچ کے ٹھہرے پانی میں ہلچل پیدا کرنا تھا۔ وہ لوگوں کی سوچ کو بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ انکے بقول سوچ کے ٹھہرے ہوئے پانی میں چند کنکر پھینک دیتے ہیں اس امید کے ساتھ کہ سطح آب پر اُٹھتی ہوئی چند ننھی منی لہریں کناروں تک پھیل جائیں گی (۹) علی عباس جلالپوری نے خرد افروزی کے راستے پر استقامت اور لگن سے چلے۔ انہوں نے اپنی تحریروں سے قاری کی سوچ کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ ادبی رسائل و جرائد کے اوراق کو پلٹیں تو علی عباس جلال پوری کے کئی افسانے ہماری نگاہ سے گزرتے ہیں۔

افسانہ 'گلناز' ستمبر ۱۹۳۸ء میں ہمایوں میں شائع ہوا۔ یہ تاریخی پس منظر کے ساتھ ساتھ ایک رومانوی کہانی ہے۔ اس کہانی میں خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے کی فتح یاب قوم کا غلاموں اور قیدیوں سے سلوک، حب الوطنی اسلام کی سربلندی، فاتح اور مفتوح قوم کے آپس کے تعلقات اور محبتوں کا ذکر ملتا ہے۔ افسانے میں محبت کے جذبے کی سرشاری کو کسی بھی قوم، مذہب، فرقے اور طبقے کے رشتوں پر مقدم رکھا ہے۔ عشق و محبت کا جذبہ ایسے دریا کی مانند ہے جس کی طغیانی اپنے عروج پر ہوتی ہے تو باقی تمام جذبے اس کے آگے ماند پڑ جاتے ہیں۔ افسانہ 'شرابی' ۱۹۳۹ء میں نیرنگ خیال میں شائع ہوا۔ افسانے میں عقل و عشق کی آویزش اور تصادم سے پیدا ہونے والے فلسفیانہ مباحثوں کو بیان کیا گیا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار نصیر جو فلسفے سے متاثر ہے اور مذہب کی توجیح بھی عقل کے اصولوں پر کرتا ہے کیونکہ مذہب کے تمام افعال کی پیروی کرنا انسان کے لیے ایک مشکل امر ہے۔ وہ شوپنہار کے فلسفے سے متاثر ہے اور اکثر اپنے دوستوں سے فلسفیانہ بحثیں کرتا ہے۔ وہ عشق پر عقل کو ترجیح دیتا ہے اور حسن و عشق کے حوالے سے وہ اکثر نفسیاتی دلائل باتیں کرتا تھا۔ افسانہ 'گلاب کا پھول' مئی ۱۹۳۹ء میں ھمایوں میں شائع ہوا۔ اس افسانے میں مرد اور عورت کے رشتوں اور رویوں پر بحث ملتی ہے۔ یہ مکالماتی طرز پر تحریر کیا گیا ہے۔ جس میں مردوں اور عورتوں کے رویوں اور جذبات کی عکاسی کی گئی ہے۔ مرد کے ہرجائی اور عورت کی وفاداری اور سلیقہ شعاری کو پیش کیا۔ گلاب کا پھول محبت کی علامت ہے۔ موضوع، کردار اور جذبات و کیفیات کی بنا پر یہ ایک اچھوتا افسانہ ہے۔

افسانہ 'تختہ ویراں' مادیت و روحانیت اور روایت و جدت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ افسانہ جنوری ۱۹۴۰ء میں ہمایوں میں شائع ہوا۔ اس کا مرکزی کردار ملک مہدی ہے جس کو جنگ عظیم اول میں نمایاں خدمات کی بنا پر آٹھ مربع زمین انعام میں دی گئی جس پر اس نے پھولوں کی کیاریاں اپنے ہاتھوں سے لگائیں۔ وہ اپنی بیٹی کی شادی اپنے دوست کے بیٹے سے کرنا چاہتا تھا۔ جو روایت پسند اور سلجھا ہوا انسان تھا۔ جب کہ اس کی بیٹی اپنے پھوپھی کے بیٹے سے محبت کرتی تھی جو کہ جدیدیت کا دلدادہ تھا۔ وہ اس کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ اکلوتی بیٹی کے جانے سے ان کا گھر ویران ہو جاتا ہے۔ 'سوتیلی بیٹی' افسانہ معاشرتی رشتوں اور خاندانی نظام پر چوٹ ہے۔ اس کہانی میں ایک سوتیلی بیٹی کے ساتھ کیے جانے والے ناروا سلوک کو پیش کیا گیا ہے۔ باپ اپنی سوتیلی بیٹی کو قبول نہیں کرتا۔ اسے باپ کا پیار نہیں دے سکتا مگر وہی باپ بڑھاپے میں

اس بیٹی کے رحم وکرم پر ہوتا ہے۔افسانہ 'بے روزگار' ۱۹۴۱ء میں ادبی دنیا میں شائع ہوا۔نوجوان کی خود غرضی کی کہانی کو بیان کیا گیا ہے۔عورت کی محبت اور معاشرے کے فرسودہ خیالات سے بھی پردہ اٹھایا گیا ہے۔علی عباس کا یہ افسانہ دوسرے افسانوں سے مختلف ہے جس میں انسانی نفسیات کو بیان کیا گیا ہے۔رفیق ایک پڑھا لکھا انسان ہے مگر بے روزگاری کی وجہ سے وہ ایک سیٹھ کے ہاں شوفر کی ملازمت کرتا ہے۔وہ سیٹھ کی بیٹی زرینہ کو عابد کی ہوس سے بچاتا ہے جس کی وجہ سے زرینہ کو رفیق سے محبت ہو جاتی ہے۔عابد انتقام لینے کے لیے سیٹھ کو ان دونوں کی محبت کا بتاتا ہے۔جس بنا پر سیٹھ رفیق کی نوکری کا بندوبست کہیں اور کر دیتا ہے اور رفیق اپنی محبت کو چھوڑ کر نوکری کے لیے چلا جاتا ہے۔بیانیہ تکنیک میں لکھے گئے رومانوی افسانوں میں جذبات اور جزئیات نگاری کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔انہوں نے کرداروں کی پیش کش میں جزئیات نگاری سے بھرپور کام لیا ہے جس سے کردار کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔اسلوب رومانویت کا حامل ہے۔لفظوں کے انتخاب میں خاصی مہارت سے کام لیتے ہیں۔کرداروں اور مناظر کی پیش کش میں تشبیہ، استعارے اور رعایت لفظی کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

> ''جاڑا شباب پر ہوتا ہے۔بادشالی کے جھکڑوں میں پرندوں کے کراہنے کی آواز سنائی نہیں دیتی مگر فاختہ انجیر کے سوکھے ٹنڈ پر بیٹھی صرصر کے تند اور یخ بستہ جھونکوں میں آنے والی بہار کے سانس کو محسوس کر لیتی ہے اور موجود زبوں حالی کو بھلا کر اپنا بے ہنگام راگ الاپنے لگتی ہے۔'' (۱۰)
>
> ''شانوں پر بالوں کی لمبی لٹیں بکھری پڑی تھیں۔اس کے نیم وا ہونٹوں میں موتی جیسے دانت شبنم کے ان شفاف قطروں کی طرح دکھائی دیتے تھے جو لالے کی پتیوں پر آفتاب کے خوف سے سہمے ہوئے پڑے لرزتے تھے۔گستاخ شمعیں بھڑک بھڑک کر اس طرف جھانک رہی تھیں اور نظارہ آتشیں کی تاب نہ لا کر اندر ہی اندر گھل جاتی تھیں۔'' (۱۱)
>
> ''سچی خوشی دل کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور جب وہی مجروح ہو جائے تو اس کو لالہ زاروں اور گلبنوں میں تلاش کرنا بے سود ہے۔'' (۱۲)

علی عباس جلالپوری کے افسانے موضوع، ہیئت، کردار سازی اور انداز بیان کے حوالے سے منفرد اہمیت کے حامل ہیں۔انہوں نے فرد کی آزادی، محبت کی سرشاری کو خصوصی اہمیت دی۔ان کے افسانوں میں محبت کے جذبے کو دوسرے تمام جذبات پر فوقیت ملتی ہے۔مرد کا تصور ہرجائی، بے وفا، مفاد پرست جب کہ عورت وفا کا پیکر، صبر وقناعت اس کا شیوہ دکھائی دیتا ہے۔کرداروں کی تخلیق میں نفسیاتی پہلوؤں کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ان کے کردار پڑھے لکھے اور فلسفہ وعقل وخرد پر مکمل عبور رکھنے والے ہیں۔اپنے افسانوں میں معاشرے کے گونہ گو حالات اور سماجی رویوں کا پردہ چاک کرتے ہیں۔انہوں نے افسانہ نگاری کے مزاج اور اسلوب کے تمام رنگوں کو ملحوظ خاطر رکھا۔اگر وہ افسانے کی طرف توجہ دیتے تو ایک بڑے افسانہ نگار کے روپ میں ہمارے سامنے ہوتے۔

ناول **پریم کا پنچھی پنکھ پسارے** علی عباس جلالپوری نے اوائل شباب میں تحریر کیا جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں زیرِ تعلیم تھے۔انہوں نے اسے اپنی دیگر علمی وتحقیقی مصروفیات کی بنا پر نظر انداز کیا۔اس ناول کو ان کی

وفات کے بعد انکی بیٹی لالہ رُخ بخاری نے اسے کتابی شکل میں ۲۰۱۱ء شائع کیا۔ ناول کا انتساب بھی لالہ رُخ کے نام ہے۔ لالہ رُخ بخاری اس ناول کی اشاعت کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> ''۱۹۸۰ء میں جب میں ہاسٹل سے جلالپور شریف گئی تو بی۔اے کے امتحانات سے فراغت پا چکی تھی۔ کتب بینی یا گھریلو امور کے علاوہ کوئی دوسرا مشغلہ نہ تھا۔ پھر ایک عجیب بات ہوئی ردی کاغذوں میں کچھ ٹکڑے نظر آئے۔ عادتاً اُلٹ پلٹ کر دیکھا تو ادبی تحریر اور جملے چاشنی آمیز معلوم ہوئے۔ چند ٹکڑے جوڑ کر پڑھنے سے جیسے آتشِ شوق کی چنگاریوں کو تحریک مل گئی اور جب مکمل مسودے کے ٹکڑوں سے یہ پریم کہانی انجام تک پڑھی تو اسے ضائع کرنے کو جی نہ چاہا اور میں نے اسے اپنی ایک کاپی پر لکھ لیا۔''(۱۳)

پریم کا پنچھی پنکھ پسارے ایسی داستانِ محبت ہے جس میں دو پیار کرنے والے الگ الگ مذہب سے تعلق رکھتے تھے مگر ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہیں جو مذہب، تہذیب اور فرقوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ یہ ناول جلالپور شریف کے پس منظر میں ہی تخلیق کیا گیا ہے۔ اس کی منظر کشی بھی جلالپور اور اس کے گرد و نواع کے علاقے کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ ناول کے مرکزی کردار بادشاہ اور کانتا ہیں۔ بادشاہ کہانی کا ہیرو اور مرکزی کردار ہے جس کا تعلق سید خاندان سے ہے جو اپنا دل ایک ہندو لڑکی کانتا کو دے بیٹھا ہے جو کہ ہندوؤں کی اعلیٰ ذات برہمن سے تعلق رکھتی ہے۔

ناول میں دونوں مذہبوں کی اعلیٰ ذاتوں کے رسم و رواج، تصادم اور رسوم کا ذکر بھی جا بجا ملتا ہے۔ بادشاہ امیر سید زادہ ہے۔ بادشاہ ایک عیاش بگڑا ہوا خوب رو اور خوش شکل نوجوان جس کی خوبصورتی کے قصے پورے گاؤں میں مشہور تھے۔ ایک دن شکار کے دوران بنہ میں آئی ہندو لڑکیوں میں سے کانتا کو دل دے بیٹھتا ہے اور اس کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ اس کے لیے تڑپتا ہے اور کسی نہ کسی طرح اس سے ملاقات کا طریقہ ڈھونڈتا ہے اور گاؤں میں موجود ایک پیشہ ور کٹنی سے کہہ کر کانتا کو ملنے کا پیغام بھجواتا ہے۔ یہ اس دور کا ایک نمایاں پہلو تھا کہ پیشہ ور کٹنیوں کے ذریعے پیسے کے عوض لڑکیوں کو ملاقات کے بہانے بلایا جاتا تھا۔ کانتا بھی بادشاہ کو دیکھ کر اسے پسند کرتی ہے۔ یوں دونوں کی محبت پروان چڑھتی چلی جاتی ہے۔ اسی دوران بادشاہ کی محبت کے دیگر قصوں (سینہ اور بلو) کی وجہ سے وہ اس سے ناراض ہو جاتی ہے اور اس کی محبت کا جواب نہ دینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ ایک دن دورانِ شکار بادشاہ کے زخمی ہو جانے پر وہ اپنی انا اور غصے کو چھوڑ کر اس سے محبت کا اظہار کر ڈالتی ہے۔

علی عباس جلالپوری کرداروں کی گفتگو کو کہیں مکالمہ اور کہیں جزئیات سے بیان کرتے ہیں۔ کانتا کی دلی کیفیات بیان کرنے میں ایک لڑکی کی نفسیاتی کش مکش حسد و غصے کے جذبات کو بہترین طریقے سے بیان کیا ہے۔ کانتا کے اظہار محبت اور دلی جذبات کا اظہار کچھ ایسے کرتے ہیں:

> ''میں نے اپنے جی میں کہا، بہاری سچ کہتا ہے پر نہیں کس سے پیار کروں۔ بادشاہ سے؟ وہ تو بگڑا ہوا ہر جائی ہے۔ ایک لڑکی گئی دوسری آئی، دوسری گئی تیسری آئی تیسری...... میں لڑکیوں کے سامنے آپ کی نندیا کرتی پر جی ہی جی میں آپ سے پریم کرنے لگی۔ آپ سپنوں میں مجھے نظر

آنے لگے۔کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کام کرتے کرتے آپ کا خیال آجاتا تو میری آنکھیں بھیگ بھیگ جاتیں اور دل میں ہوک اُٹھتی۔"(۱۴)

بادشاہ اور کانتا دونوں ایک دوسرے کی محبت سے سرشار ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ بادشاہ جیونی کٹنی سے کہہ کر اکثر کانتا کو رات کے پہر بیٹھک میں بلوا لیتا۔ جہاں دونوں پریمی دنیا کی ریت روایتوں سے الگ اپنی دنیا سجاتے اور محبت کے سروں میں کھو کر عشق کی سرشار وادیوں میں کھو جاتے ہیں۔محبت کی اس کیفیت اور خود سپردگی کو ناول میں یوں بیان کرتے ہیں:

"چنبیلی کے پھولوں کی خوشبو،اُس کے سر کے بالوں کی خوشبو،اُس کے لب ودہن اور سانسوں کی خوشبو سارے میں پھیل گئی اور اُس کے گدرائے ہوئے بدن کا چندن مہک اُٹھا۔میرے ہاتھوں پر اُس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تو وہ پھر گستاخیوں پر اُتر آئے اس نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔"(۱۵)

محبت کے سفر میں بادشاہ اور کانتا کے درمیان زمانہ، مذہب،رسم ورواج اور ذات پات کی دیواریں حائل ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔جو ان کو الگ کر دیتی ہیں اور یوں پریم کہانی معاشرتی رسم وروج اور ریت روایتوں کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔اس کہانی کا اختتام بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔علی عباس جلالپوری نے ناول میں ہندو مسلم تہذیب کو بھی پیش کیا ہے۔جہاں ہندو اور مسلمان آزادانہ زندگی گزارتے تھے۔ رواداری، اخوت ومحبت کا ماحول تھا دونوں اپنی اپنی عبادت گاہوں کے لیے آزاد تھے اور آزادانہ طریقے سے اپنے اپنے مذہبی فرائض سرانجام دیتے تھے۔ ہندوؤں کے مذہبی رسومات کی ادائیگی کی رسومات کے حوالے سے یہ اقتباس ملاحظہ:

"درگاہ کے قریب ہی ہندوؤں کا دیوی استھان تھا۔اب ویران پڑا ہے۔ جہاں منگلا دیوی کی مورتی رکھی تھی۔اتفاق سے اُسی روز ہندو بھی پوجا پاٹ کے لیے دیوی استھان پر آنے لگے۔وہ دیوی کا کوئی تہوار منا رہے تھے۔ ہندوؤں نے استھان تک جانے کا رستہ پہاڑیوں میں بنا لیا تھا جس پر ہم بھی آیا جایا کرتے تھے۔"(۱۶)

ناول میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی مذہبی برتری کا احساس بھی دکھائی دیتا ہے۔بادشاہ جو کہ ایک سید زادہ اور کانتا ہندوؤں کی اونچی ذات برہمن سے تعلق رکھتی ہے۔ذات کی برتری کا احساس ہندوؤں میں بھی تھا اور مسلمانوں میں بھی۔کانتا کی ماں کو جب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بیٹی مسلمان سے پیار کرتی ہے تو اس کا رویہ اشتعال انگیز ہوتا ہے۔اپنی ذات اور دھرم کی برتری اسے یہ بات قبول کرنے نہیں دیتی کہ اس کی بیٹی ایک مُسلے گوشت خور سے محبت کرتی ہے، غصے سے آگ بگولا کانتا کو کہتی ہے:

"جنم جلی! کل موہی! نکرمی، رنڈی! تو اُس موئے گئو کھانے مُسلے کے پس کیوں گئی تھی۔"(۱۷)

ایک اور جگہ کہتی ہے کہ:

"چھی چھی! وہ پشو ہیں، ملیچھ ہیں۔"(۱۸)

ذات پات کی برتری کا احساس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں اور ہندوؤں کی سماجی اور معاشرتی قباحتوں اور

خرابیوں کو بھی بیان کیا گیا ہے۔اس ناول میں سماجی رویوں اور مذہبی کمزرویوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔کانتا کی ماں بادشاہ کو سید زادہ ہونے اور تعویذ دھاگے کرنے کے طعنے بھی دیتی ہے۔مسلمان پیروں فقیروں کی چال بازیوں پر طنز کرتے ہوئے بادشاہ کو کہتی ہے:

''لوگ دور دور سے چل کر تمہاری گدی پر آتے ہیں کیوں کہ تم لوگ کالاعلم جانتے ہو اور اس کے بل پر لوگوں کی کٹھنائیاں دور کرتے ہو،ٹھیک ہے ناں؟''(۱۹)

ایک اور جگہ کہتی ہے:

''میں گدی والے کو بھی جانتی ہوں اور برسوں سے دیکھ رہی ہوں کہ تم لوگوں نے مکر کی لیلا رچا رکھی ہے۔تم بھولے بھالے لوگوں سے دھن ماٹھتے ہو اور سیدھی سادی ناریوں کی عزتیں لوٹتے ہیں۔''(۲۰)

مسلمانوں کے جعلی پیروں کے ساتھ ساتھ ہندو منہتوں کی برائیوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔علی عباس جلالپوری نے کرداروں کو بیان کرنے میں جزئیات نگاری کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ہر کردار کو اس کی ذات کی خوبیوں خامیوں سمیت بیان کیا ہے۔معاشرے میں موجود مرد کے تصور کو بیان کیا ہے۔کانتا کے سوتیلے باپ چمن لال کی حقیقت بیان کرتے ہوئے سماجی برائیوں کا ذکر کیا ہے۔کانتا کا سوتیلا باپ ایک شیطانی خصلت کا حامل انسان جس کو رشتوں کے تقدس کا ذرا بھی لحاظ نہیں۔کانتا کے جوان ہونے پر وہ اسے بری نیت سے دیکھتا ہے اور اس کی خوبصورتی کی وجہ سے بیٹی کو بھی ہوس کا نشانہ بنانا چاہتا ہے۔

''میں نے تم پر ہزاروں روپے خرچ کیے ہیں تمہیں پالا ہے، پڑھایا ہے۔اب کسی اچھی جگہ تیرا وواہ رچانے کا وچار کر رہا ہوں،پھر دلار سے کہا اب تمہیں چاہیے کہ مجھے خوش کرو اور میری بات مانو۔''(۲۱)

ناول کے اختتام پر بادشاہ اور کانتا کے درمیان مذہب کی دیوار حائل ہو جاتی ہے اور الگ الگ مذہبوں سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ان کا ملنا ناممکن ہو جاتا ہے۔کانتا کی ماں بادشاہ کے ساتھ اس کی شادی پر تیار نہیں ہوتی اور یوں دونوں کے راستے الگ ہو جاتے ہیں۔

علی عباس جلالپوری نے ناول میں منظر نگاری بہت خوبصورت انداز میں کی ہے۔جلالپور کے علاقے کی تصویر کشی اس انداز میں کی ہے کہ قاری پر پورا منظر جزئیات نگاری سے واضح ہو جاتا ہے۔خوبصورت پہاڑوں، ساون دنوں کے،جنگلوں کے اونچے نیچے ٹیلوں، بنھ کی چٹانوں، بستی ندیوں، بدلتے موسموں کی منظر کشی بہت عمدہ طریقے سے کی گئی ہے۔اقتباس ملاحظہ کریں:

''ساون کا ایک سہانا دن تھا۔آسمان پر چاروں طرف اَبر چھایا ہوا تھا۔ہم صبح سویرے شکار کھیلنے کے لیے پہاڑوں میں نکل گئے اور دوپہر تک ادر اُدھر مارے مارے پھرتے رہے۔ہڑیالوں کا گلا تو ایک طرف رہا ہم نے کسی ہڑیال کا سینگ تک نہ دیکھا۔اتنے میں بادل چھٹ گئے، کڑی دھوپ نکل آئی اور ہوا تھم گئی۔''(۲۲)

علی عباس جلالپوری کا ناول اور حقیقت معاشرے کی تلخ سچائیوں، انسانی رویوں، محبتوں کے جذبوں اور مذہبی تصادم کی عکاسی کرتا ہے اس ناول میں سید زادے کے کردار میں علی عباس جلالپوری کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ درحقیقت بادشاہ کے کردار میں علی عباس جلالپوری خود کو پیش کرتے ہیں۔ ناول میں پوٹھوہاری زبان کے الفاظ بھی استعمال کی گئی ہے۔ جلالپور کے علاقے کی زبان کے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔ انہوں نے علاقائی زبان کا بھی خوب فائدہ اٹھایا۔ یہ الفاظ ناول میں ہمیں اجنبیت کا احساس تک نہیں ہونے دیتے۔ ناول موضوع، ہئیت، کردار سازی، لفظیات اور اندازِ بیان کے منفرد قرینوں کے اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ ضیاء حسین ضیاء کے نزدیک:

''محبت کی سرمستی سے جھلکتا یہ ناول ناول نگار کی زبان و بیان کی سروقامتی، فقرہ بندی میں گلشن آرائی اور نفس مضمون میں حسیات نگاری کا آئینہ دار ہے۔۔۔اس ناول میں ہندی ساجیات میں جھلکتی ریشم واطلس جذبات کی زربانی جن حسین مکالمات اور درداریت سے کی گئی ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ اگر جلال پوری صاحب شعروادب کی طرف بھی اپنے میلان کو باقی رکھتے تو اس میدان میں بھی اس کی ارفع صلاحیتوں کا لوہا مانا جاتا۔'' (۲۳)

جلالپوری کا یہ ناولٹ محبت کی ایک ایسی کہانی ہے جو ذات پات، قوم و مذہب، اونچ نیچ، کی تمام جکڑ بندیوں کی نشان دہی کرتی ہے۔ حسن وعشق کی شگفتگی اور دلنشین مکالمے، دیہات کا پس منظر اور تحریر کا گداز قابل دید ہے۔ اس ناول میں فرد مذہبوں اور روایتوں میں قید، زنجیروں میں جکڑا ہوا نظر آتا ہے۔ جذباتیت کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ روایت رسموں اور مذہبوں کا تصادم ہے۔ جلالپور شریف کا خطہ توجہ کا مرکز و محور ہے۔ ذات پات اور معاشرتی تصادم کے نفسیاتی مسائل، جنسی کشش اور محبت کے جذبوں کی سرشاری ہے۔ ناول کے کردار سلجھے ہوئے اور سمجھدار دکھائی دیتے ہیں۔ علی عباس جلالپوری ناول کے مزاج کو سمجھتے تھے اور اگر وہ مزید ناول لکھتے تو ایک بڑے ناول نگار کے طور پر بھی سامنے آسکتے تھے۔ ان کا مطالعہ وسیع اور اندازِ بیان سلیس اور سادہ ہے۔ موضوع پر گرفت مضبوط تھی اور اسواب میں دلکشی بھی پائی جاتی ہے۔

علی عباس جلالپوری نے جہاں افسانے اور ناول لکھے وہیں انہوں نے دو ڈرامے بھی تحریر کیے۔ پہلا سٹیج ڈرامہ 'قوس قزاح' جو انہوں نے گورنمنٹ ڈگری کالج سیٹلائیٹ ٹاؤن، گوجرانوالہ میں سٹیج پر پرفارم کروایا تھا۔ جب کہ دوسرا ڈرامہ 'تمکنت' فنون میں چھپا۔ ایک تمثیلی کہانی ہے۔ اس ڈرامہ کے پانچ منظر ہیں۔ ڈرامے کا مرکزی کردار تمکنت ہے۔ ڈرامہ میں محبت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ تمنا، شاہ رُخ سے محبت کرتی ہے جب کہ اس کا باپ ان دونوں کے رشتے کے خلاف ہیں۔ ناصرہ اپنی تمام زندگی بے رُخی اور سخت مزاجی کے ساتھ گزارتی ہیں مگر وہ اپنی بیٹی کی خوشیوں کے لیے ڈاکٹر اکبر کے فیصلے کے خلاف کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر اکبر ایک خوش طبع انسان تھے مگر محبت کی ناکامی کے بعد سخت گیر انسان کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ شاہ رُخ کے باپ کی وجہ سے اُنھیں اپنی محبت سے دستبردار ہونا پڑا تھا جس کا بدلہ وہ اس کے بیٹے سے لینا چاہتا ہے اور وہ اس بدلے اور غصے میں اپنی بیٹی کی خوشیوں کی بھی پروانہیں کرتا۔ ڈاکٹر اکبر، تمکنت کی محبت کو اپنے دل سے نہ نکال سکا۔ تمکنت اور اکبر کی محبت، سماجی مجبوریوں کی بنا پر کامیاب نہ ہوسکی۔

برسوں بعد جب تمکنت ان سے ملنے آتی ہے تو وہ بیماری کے باعث بہت کمزور ہو چکی ہوتی ہے۔ وہ اپنی زندگی

کے آخری ایام گزار رہی ہوتی ہے۔ ناصرہ کی بدولت اسے اکبر کے سخت رویے کا علم ہوتا ہے۔ تو تمکنت ناصرہ سے وعدہ کرتی ہے کہ ڈاکٹر اکبر تمنا کی خوشیوں میں رکاوٹ نہیں بنیں گے۔ یوں وہ اکبر سے اپنی محبت کے بدلے میں تمنا کی خوشیاں مانگ لیتی ہے۔ ڈرامہ میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ محبت کی ناکامی کے بعد انسانی رویوں میں سختی آجاتی ہے مگر وہی محبت کرنے والا شخص جب اس کے سامنے آجائے تو وہ پگھل جاتا ہے۔ نثری تحریروں کے حوالے علی عباس جلالپوری کے تمام موضوعات میں محبت کا جذبہ غالب دکھائی دیتا ہے۔ ان کا اسلوب سادہ اور عام فہم ہے۔ البتہ خیالات کے حوالے سے ان کی تحریروں فلسفیانہ نظریات کو واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

خطوط دراصل ادیب کی زندگی کے نہاں خانوں کی داستان ہوتی ہے جس کے ذریعے سے ہمیں ان کی نجی زندگی کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہے۔ مکاتیب سید علی عباس جلالپوری وہ خطوط ہیں جنہیں ان کی وفات کے بعد انکی صاحبزادی لالہ رُخ بخاری نے تخلیقات، لاہور ۲۰۱۳ء میں شائع کرائی۔ یہ خطوط انہوں نے اپنی زندگی میں لکھے تھے۔ اس مجموعے میں علی عباس جلالپوری کے کل ۱۰۱ خطوط شامل کیے گئے ہیں۔ لالہ رخ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اپنے والد کے ساتھ گزرا انہیں زندگی میں قدم قدم پر ان کی رہنمائی میسر رہی۔ علی عباس جلالپوری پر جب فالج کا حملہ ہوا تو ان کا داہنا ہاتھ متاثر ہوا جس سے وہ لکھنے سے قاصر ہو گئے تو دورانِ بیماری ان کے بیشتر خطوط کے جواب لالہ رُخ ہی تحریر کرتی تھیں۔ لالہ رُخ بخاری لکھتی ہیں کہ:

> ''والد گرامی کا مجھ سے بحیثیت بیٹی، لیکچرار، تیماردار، رازدار ایک خصوصی تعلق تھا، جس کی بدولت میری ان کے ساتھ خط و کتابت بھی رہتی تھی۔ اکثر موصول ہونے والے خطوط کے جوابات بھی مجھ سے ہی لکھوایا کرتے تھے۔ میری عدم موجودگی میں حامد بھائی جان یا جعفر بھائی بھی یہ فریضہ انجام دیا کرتے تھے۔ ابا جان کی عادت تھی کہ پہلے خط املاء کروایا کرتے۔ پڑھنے کے بعد عبارت میں قطع و برید کرواتے، دوبارہ پڑھتے اور صاف کر کے لکھواتے۔ میں صاف کر کے تحریر کو سپردِ ڈاک کر دیتی اور ترمیم شدہ تحریروں پر مبنی کاغذات محفوظ رہتے۔ چنانچہ والد گرامی نے مجھے یا دیگر اہلِ خانہ کو خطوط تحریر کیے وہ تو میرے پاس محفوظ تھے ہی لیکن میرے ہاتھ سے لکھوائے گئے خطوط بھی میرے پاس رہ گئے۔''(۲۴)

ان خطوط کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ علی عباس جلالپوری کی حالات زندگی کے مختلف واقعات کا پتا چلتا ہے۔ نجی خطوط میں زندگی کے متنوع اور دلچسپ نقوش اُبھرتے ہیں۔ روزمرہ زندگی کے معاملات میں وہ کیسے سوچتے ہیں، بیوی بچوں کے ساتھ محبت ہے، عزیز و اقارب، ملازمین، دوست احباب یہاں تک کہ جانوروں سے محبت کا علم بھی ہوتا ہے۔ یہ خطوط نجی زندگی کے نہاں خانوں میں ایک عظیم فلسفی کے علم و شعور اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر طارق جاوید لکھتے ہیں کہ:

> ''ان خطوط کے مطالعہ سے راقم الحروف پر منکشف ہوا کہ عظیم دانشور علی عباس اور ان کی عام زندگی میں کوئی تضاد نہیں۔ علم، دانش اور لکھنے کے حوالے سے انہوں نے جو اصول مرتب کر رکھے تھے، زندگی

کے عام معاملات اور طرزِ عمل میں بھی انہی اصولوں کی کارفرمائی ہر جگہ دکھائی دیتی ہے۔"(۲۵)

دوست، احباب اور ادباء اور شعراء کو تحریر کیے گئے خطوط سے ان کے نظریات اور افکار کی وضاحت ہوتی ہے۔ ایسے تمام خطوط جو نوجوانوں کو تحریر کیے گئے ہیں ان میں بیماری کے باوجود کم ہمتی اور مایوسی کو قریب نہیں آنے دیا۔ ان خطوط کے ذریعے ان کی ترقی پسند افکار، خرد افروزی، انقلابیت، اشتراکیت اور مارکسزم سے وابستگی کا علم ہوتا ہے۔ لالہ رخ بخاری نے خطوط کے مفصل حاشیے خطوط کے ساتھ تحریر کیے ہیں۔ بعض خطوط کے سنین درج نہیں تھے انہیں سنین کے بغیر ہی شائع کر دیا گیا ہے۔ مگر مکمل تفصیلات جہاں جہاں درکار تھیں حواشی میں دی گئی ہیں تاکہ خطوط کے متن کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

سب سے پہلے لالہ رُخ نے اپنی والدہ کا خط شائع کیا ہے۔ حرفِ آغاز میں والدہ کا مکمل تعارف، نجی زندگی اور مصروفیات زندگی کے متعلق مکمل رہنمائی ملتی ہے۔ ان کی والدہ ایک باہمت، پڑھی لکھی اور سلیقہ شعار خاتون تھیں۔ جنہوں نے ساری زندگی اپنے شوہر اور بچوں کی بہتری کے لیے بہترین اقدام اٹھائے۔ اس کے بعد علی عباس جلالپوری کے وہ خطوط ہیں جو انہوں نے اپنی ملازمت کے دوران مختلف موقعوں پر اپنی بیگم کو تحریر کیے۔ ان کی تعداد ۲۵ ہے۔

شہزادی بیگم کے نام خطوط پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں ان کی بہت فکر تھی۔ ملازمت کے سلسلے میں جہاں بھی رہتے حتی الامکان کوشش کرتے بیوی بچے اُن کے کو ہمراہ رہیں مگر بعض مجبوریوں کی بنا پر انہیں تنہا بھی رہنا پڑا۔ وہ جہاں بھی مقیم ہوتے شہزادی بیگم کو خرچ بھیجتے۔ خطوط میں بچوں، پڑوسیوں، خادموں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"بوڑھی نوکرانی کو پانچ روپیہ ماہوار کرلو یا اس سے زیادہ جو مناسب ہو، کپڑے بھی لے دینا۔"(۲۶)

ان خطوط میں سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ ساتھ مزاح کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔ اکثر خطوط میں پالتو جانوروں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی حس لطافت بہت بہترین ہے ایک خط میں مرغیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"ہم لوگ بفضلہ بہ خیریت تمام یہاں پہنچ گئے ہیں۔ تمہارے مرغوں نے البتہ خاصا پریشان کیا۔ پہلے تو بس کی چھت پر ٹوکرا رکھتے وقت دو مرغ بھاگ نکلے۔ انہیں پکڑنے میں کئی آدمیوں نے دوڑیں لگائیں، بارے پکڑ دھکڑ کر پھر ٹوکرے میں ٹھونس دیئے، بس ہرن پور پہنچی تو مرغا پھر اُچک کر بھاگ نکلا، فیصل نے جوں توں اسے پکڑا، رسیاں بہت بودی تھیں، انہیں بک کرانا بھی ایک مرحلہ تھا۔ بہرصورت وہ یہاں کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی گئی ہیں اور تادمِ تحریر خوش ہیں۔"(۲۷)

حامد رضا کو تحریر کیے گئے خطوط کی تعداد ۱۰ ہے۔ ان خطوط میں اکثر معلومات اور باتیں شہزادی بیگم کے خطوط والی ہیں۔ جیسے گھر کی مرمت و خیال، دیگر بچوں کی صحت و تعلیم کا احوال پوچھا گیا ہے۔ کچھ میں انہیں ضروری امور کی ہدایت دی گئی ہیں۔ جعفر رضا کو تحریر کیے جانے والے خطوط کی تعداد ۵ ہے۔ ان میں بھی گھریلو امور کے بعد جعفر رضا کے پرچوں اور کامیابیوں پر داد و تحسین ملتی ہے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں مگر ساتھ ساتھ ایک بہترین استاد اور نقاد کی طرح ان کی اصلاح کا کام بھی خط سے لیتے ہیں۔ اکثر خطوط میں املا کی اغلاط اور لفظوں کی درستی کرتے دکھائی دیتے ہیں ایک خط میں لکھتے ہیں:

''تم تو چھپے ہوئے ادیب ہو۔البتہ ایک چُوک تم سے ہوگئی بہر حال کو بحر حال لکھ دیا۔ یہ لفظ بہ ہر حال (بہر حال) ہے۔بحر تو سمندر کو کہتے ہیں ناں۔''(۲۸)

لالہ رُخ بخاری کے نام ۲۸ خطوط شامل ہیں۔ان میں ان کی نجی زندگی کے معاملات بہت کھل کر سامنے آتے ہیں۔ان خطوط سے کم وبیش دس سالوں کے امور زندگی پر روشنی پڑتی ہے اور ساتھ ہی ایک باپ کی اپنی بیٹی کے لیے بے پناہ فکر، محبت شفقت اور دلی وابستگی کا علم ہوتا ہے۔لالہ رُخ کو تحریر کیے گئے خطوط ان کی ذاتی زندگی، تعلیم اور ذہنی رجحانات سے متعلق ہیں۔ان خطوط میں انکی شخصیت ایک شفیق باپ کے ساتھ ساتھ ایک ایسے استاد کے روپ میں نظر آتے ہیں جو اپنی اولاد کے بہتر مستقبل، تعلیم اور زندگی کے حوالے سے نہ صرف پر امید ہے۔اکثر خطوط میں نصیحتیں اور کامیابیوں پر مبارکباد دی گئی ہے۔پہلی بار رسالے میں چھپنے والی نظم کی اطلاع یوں دی کہ:

''تمہاری نظم 'لمحے' اگست (۱۹۸۳ء) کے 'محفل' میں چھپ گئی ہے۔تم پہلی بار اپنا نام چھپا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہوگی۔''(۲۹)

اس کے بعد ادباء شعراء اور دوست احباب کو تحریر کیے خطوط ہیں۔جن میں جگتار سنگھ کو تحریر کیا ہوا ایک خط شامل ہے۔جس میں اپنی کتاب کی اغلاط کی درستی اور ان کی پنجابی ڈکشنری کے بارے میں معلومات کا علم ہوتا ہے۔دو خطوط احمد ندیم قاسمی کو بھی تحریر کیے۔ یہ خطوط علی عباس جلالپوری کے ذوقِ فن کی نشاندہی کرتے ہیں۔ان خطوط میں کرار نوری کی شاعری کے پسندیدہ نو اشعار تحریر کر کے اپنی پسندیدگی اور ان کے فن کی داد دی ہے۔جس سے ان کے شعری ذوق کا علم ہوتا ہے۔ دوسرے خط میں آدم جی ایوارڈ نہ لینے اور بے نظیر بھٹو کی جانب سے دیے جانے والے ایوارڈ کو قبول کرنے کی وجوہات کے بارے میں تحریر کیا گیا ہے۔لالہ رُخ بخاری کی پبلک سروس کمیشن میں کامیابی کی اطلاع دیتے ہیں۔ایک خط سے احمد ندیم قاسمی اور علی عباس جلالپوری کی ناراضی کا علم بھی ہوتا ہے۔دونوں ایک دوسرے سے خفا تھے۔جس کا علم ان کے خطوط سے ہوتا ہے۔سید سبط الحسن ضیغم کو تحریر کیا گیا۔خط بظاہر بہت سادہ ہے۔جو ان کی صحت یابی کے لیے تحریر کیا گیا۔خطوط کی عبارت بہت دل نشیں ہے جیسے مخاطب سے روبرو گفتگو کر رہے ہوں۔خط کا آغاز ان الفاظ سے کرتے ہیں کہ:

''سجن جی وسدے رہو۔''(۳۰)

مشتاق احمد کے نام لکھے گئے خطوط کی تعداد ۴ ہے۔مشتاق احمد ذہین اور قابل نوجوان جو ان کی تخلیقات اور شخصیت سے متاثر تھے۔ان کی خرد افروزی کی تحریک نے ان میں ایک نیا جوش وجذبہ پیدا کیا۔انہوں نے جب اپنا شعری مجموعہ 'دشتِ نو' جلالپوری کو بھجوایا تو دل کھول کر ان کی حوصلہ افزائی کی۔ان خطوط سے ان کی ترقی پسندی، انقلابیت اور اشتراکیت کے نقطہ نظر کی وضاحت ہوتی ہے۔وہ دنیائے اسلام کی ترقی و بہتری کے لیے خرد افروزی کی تحریک کو ضروری سمجھتے تھے۔ایک خط میں لکھتے ہیں:

''ہم جہالت، ریاکاری اور جنون کی تاریکیوں میں گرے ہوئے ہیں۔ ہمارا منصب ہے کہ خرد افروزی کی شمع روشن رکھیں۔''(۳۱)

گلباز آفاقی نے پاکستانی ٹائمز میں علی عباس کے بارے میں معلومات فراہم کیں۔ان میں جو اغلاط تھیں ان کی

توضیحات پیش کی گئی ہیں۔انہوں نے کل ۱۸ اغلاط کی نشاندہی اس خط میں کی ہے۔ایم سلیم کو خط ان کی کتاب 'جدید فلکیات' موصول ہونے پر تحریر کیا جس میں کتاب پر تبصرہ بھی کیا اور اسے ایک بہترین علمی کاوش قرار دیا۔نبیلہ بی بی نے فنون رسالے میں علی عباس جلالپوری کی تحریریں پڑھیں اور وہاں سے ان کا خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔وہ ترقی پسند خیالات کی مالک تھیں۔خطوط میں نبیلہ کو اُن کی والد کی وفات کے بعد زندگی کی کڑی مشکلات اور آزمائشوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا حوصلہ دیتے ہیں اور انہیں زندگی میں آگے بڑھنے کی تلقین کرتے ہیں۔محمد اشرف،سجاد ظہیر،فیض اور دیگر ترقی پسند مصنفین کی کتب پڑھنے کی تلقین کرتے ہیں۔پروفیسر ظفر علی خان جلالپوری کے دوست جنھوں نے ان کی کئی کتب شائع کرائیں۔وہ 'اتحاد اساتذہ' کے چیف ایڈیٹر تھے۔انکے نام جلالپوری نے کئی خط تحریر کیے مگر لالہ رُخ کے پاس ایک خط تھا جس کو انہوں نے شامل کر دیا۔آغا امیر حسین کلاسیک پبلشر لاہور کے مالک تھے۔جنھوں نے ان کی کتاب تاریخ کا نیا موڑ شائع کی مگر انہوں نے مقالاتِ جلالپوری شائع کرنے سے انکار کر دیا۔ان کے نام تحریر کیے گئے خطوط میں مسودہ واپس بھیجنے پر غصے و ناراضی کا اظہار بھی ملتا ہے۔سید محمد کاظم کا ایک خط اس مجموعے میں شامل ہے جس میں انہوں نے احمد ندیم قاسمی سے گلے کا اظہار کیا،کاظم صاحب کی وساطت سے ہی قاسمی صاحب تک پہنچا اور یوں وہ اُن سے ناراض ہو گئے۔ادب کے ایک عظیم فلسفی استاد اور بہترین ناقد کی زندگی کے مخفی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔جس سے ان کی شخصیت،افکار اور نظریات کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

علی عباس جلالپوری کے خطوط کی نثر دلچسپ اور سادہ ہے۔نثر میں ہمواری،تسلسل،قطعیت،لسانی و علمی افکار کی ترجمانی ان کے منظّم ذہن کی غماز ہے۔بعض خطوط میں غم و غصہ اور ناراضی کا اظہار بھی ملتا ہے مگر وقار،تحمل اور برداشت سے گلے شکوے کو دور کرتے دکھائی دیتے ہیں۔خطوط میں مزاح اور شگفتگی کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔علی عباس جلالپوری کی نثری تخلیقات کو دیکھتے ہوئے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک منفرد ادیب بھی تھے۔

حوالہ جات

۱۔ شان الحق حقی، فرہنگ تلفظ،(اسلام آباد،ادارہ فروغ قومی زبان اردو،۲۰۱۷ء)،مرتبہ،ص۱۸

2۔ Encyclopedia Britannica، vol.10 p.1041

۳۔ جمیل جالبی،ادب کلچر اور مسائل،(کراچی:رائل بک کمپنی،۱۹۸۶ء)،مرتبہ،ص۱۵

۴۔ خالداقبال یاسر،ادب اور زمانہ،(لاہور:ادارہ ثقافت اسلامیہ،۲۰۱۴ء)،ص۱۰۳

۵۔ محمد خاورنوازش،ادب، زندگی اورسیاست(نظری مباحث)،(فیصل آباد:مثال پبلشرز، ۲۰۱۲ء)،مرتبہ،ص۱۶

۶۔ علی عباس جلال پوری،مقالات جلالپوری،(لاہور:تخلیقات،۲۰۰۰ء)،ص۱۰

۷۔ انٹرویو:سیدحامدرضا جلال پوری،۳۱راگست ۲۰۱۸ء،بروز جمعہ،وقت ۴:۳۰

۸۔ انٹرویو:امجد علی شاکر،۵رستمبر ۲۰۱۸ء،بروز بدھ،وقت ۶:۳۰

۹۔ علی عباس جلال پوری، عام فکری مغالطے،(لاہور:تخلیقات،۲۰۱۳ء)،ص۹

۱۰،۱۱۔ علی عباس جلال پوری،گلنار،مشمولہ: ہمایوں،(لاہور:ستمبر ۱۹۳۸ء)،ص۶۸۲

۱۲۔ علی عباس جلال پوری،گلاب کا پھول،مشمولہ: ہمایوں،مئی ۱۹۳۹ء،ص۳۵۲

۱۳۔ علی عباس جلال پوری،پریم کا پنچھی پنکھ پسارے،(فیصل آباد: زرنگار بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۱ء)،ص۹

۱۴۔ ایضاً،ص۴۲ ۱۵۔ ایضاً،ص۳۸ ۱۶۔ ایضاً،ص۳۲

۱۷۔ ایضاً،ص۵۹ ۱۸۔ ایضاً،ص۶۸ ۱۹،۲۰۔ ایضاً،ص۶۳

۲۱۔ ایضاً،ص۵۴،۵۵ ۲۲۔ ایضاً،ص۱۱ ۲۳۔ ایضاً،۷،۸

۲۴۔ لالہ رُخ بخاری، مکاتیب علی عباس جلال پوری،(لاہور:تخلیقات،۲۰۱۳ء)،مرتبہ،ص۱۰،۱۱

۲۵۔ طارق جاوید،مقدمہ:مکاتیب علی عباس جلال پوری،ص۱۵

۲۶۔ سیدعلی جلالپوری،مکتوب بنام،شہزادی بیگم،ص۵۸

۲۷۔ لالہ رُخ بخاری،مکاتیب علی عباس جلال پوری،مرتبہ،ص۱۸

۲۸۔ سیدعلی عباس جلال پوری،مکتوب بنام جعفر رضا،ص۸۸

۲۹۔ سیدعلی عباس جلال پوری،مکتوب بنام لالہ رُخ بخاری،ص۱۱۶

۳۰۔ سیدعلی عباس جلال پوری،مکتوب بنام سید سبط الحسن ضیغم،ص۱۳۴

۳۱۔ لالہ رُخ بخاری،مکاتیب علی عباس جلال پوری،مرتبہ،ص۳۰